انٹرویو

ڈاکٹر رشید احمد جالندھری

[سابق ڈائریکٹر ادارۂ ثقافتِ اسلامیہ، لاہور]

جناب ڈاکٹر رشید جالندھری کا شمار ہمارے ان دانشوروں میں ہوتا ہے جنھیں قدرت نے علم وحکمت کی دولت سے بھی بے پناہ نواز رکھا ہے اور جرأتِ اظہار کی خوبی بھی وافر عطا کر رکھی ہے۔ وہ مولانا ابوالکلام آزاد کی روش کے آدمی ہیں جو پامال راہوں پر چلنے کی بجائے نئی راہیں تلاش کرتے ہیں۔ جمود کی بجائے حرکت اور تقلید کی بجائے اجتہاد کو چراغِ راہ بناتے ہیں۔ یہی خوبی کبھی اُن کے لیے ابتلا اور آزمائش بھی لاتی رہی، لیکن وہ استقامت کے کوہِ گراں ثابت ہوئے۔ جنرل ضیاء الحق روایتی مذہبی سوچ کے مالک تھے۔ ان سے اختلاف رکھنے والا کوئی آدمی دم نہیں مار سکتا تھا۔ اُنھوں نے ڈاکٹر صاحب کو پہلی دفعہ ۱۹۷۸ء میں ادارہ تحقیقاتِ اسلامی کی ڈائریکٹرشپ سے اس لیے فارغ کر دیا کہ اُنھیں ڈاکٹر صاحب کا شامِ ہمدرد میں پیش کیا گیا مقالہ ''اسلام میں ریاست کا تصور'' پسند خاطر نہ ہوا۔ ڈاکٹر صاحب نے بحالی کے لیے نہ کوئی درخواست دی نہ کسی سفارش کو وسیلہ بنایا۔ ایک وقت آیا کہ بریگیڈیئر (ر) آغا اکبر شاہ، وائس چانسلر بلوچستان یونیورسٹی نے مرحوم ڈاکٹر محمد افضل کے مشورہ سے ڈاکٹر رشید کو اپنے ہاں صدرِ شعبہ اسلامیات مقرر کر دیا۔ ۱۹۸۲ء میں ڈاکٹر صاحب نے شوریٰ کی اسلام میں اہمیت کے بارے میں ڈاکٹر فضل الرحمٰن کا ایک مضمون یونیورسٹی کے انگریزی مجلے میں شائع کیا۔ کچھ لوگوں نے لگائی بجھائی کر دی کہ اس میں درپردہ ضیاء الحق کی مجلس شوریٰ پر

طنز وتعریض کی گئی ہے۔ جنرل صاحب ایک بار پھر بپھر گئے اور ڈاکٹر صاحب کو سروس سے دوبارہ فارغ کر دیا۔ ڈاکٹر صاحب خموشی سے ایک طرف ہو گئے۔ علمی وقار اور خودداری کا دامن تھامے رہے — دو سال کے لیے فل برائٹ سکالرشپ پر ہارورڈ اور شکاگو یونیورسٹیوں میں چلے گئے۔ جہاں پروفیسر سمتھ اور ڈاکٹر فضل الرحمٰن کے ساتھ مل کر علمی تحقیق میں مشغول ہو گئے۔ ۱۹۹۲ء میں ادارۂ ثقافتِ اسلامیہ لاہور کی مجلسِ منتظمہ نے انہیں ادارے کا ڈائریکٹر تعینات کر دیا۔ ہم نے ان سے اپنی زندگی کی کہانی سنانے کی درخواست کی اور یہ بھی استفسار کیا کہ آج اسلام کی نئی تشریح وتعبیر کیسے کی جا سکتی ہے؟

سوال: ڈاکٹر صاحب! آپ پہلے ہمیں اس ماحول کے متعلق کچھ بتائیے جس میں آپ نے تعلیمی سفر کا آغاز کیا۔ آپ کو کن اساتذہ سے علمی فیض حاصل ہوا؟

جواب: آپ نے بڑا مشکل سوال لیا ہے۔ آج لوگ شاید ان روایات اور ان ہستیوں کو پوری طرح سمجھ نہ سکیں، جن سے ہم متعارف ہوئے تھے۔ ایک عجیب زمانہ تھا۔ دوسری عالمی جنگ کے دن تھے۔ ہمارے گاؤں میں عربی کا ایک معروف مدرسہ تھا جو ہمارے گھر کے قریب ہی واقع تھا۔ جو اساتذہ وہاں پڑھاتے تھے، اُن سے میرے والد مرحوم کے تعلقات تھے۔ ابھی خاکسار نے مڈل سکول کا امتحان پاس کیا تھا اور ہائی سکول میں داخلہ کے لیے تیاری کر رہا تھا کہ ایک روز مجھے والد صاحب اس مدرسے کے استاذ مرحوم مولانا عبدالعزیز صاحب کے پاس لے گئے۔ اس وقت دوسری جنگِ عالم گیر چھڑ گئی تھی، لوگوں میں دُنیا کی ناپائیداری اور آخرت میں جوابدہی کا احساس شدت سے تھا۔ لوگ اپنی اولاد کو دینی تعلیم بہت ذوق شوق سے دلاتے تھے۔ چنانچہ خاکسار نے اس مدرسے میں قرآن مجید اور فارسی کی کتابیں پڑھیں۔ جن استادوں سے خاکسار نے پڑھا، اُن کے بارے میں بہت اطمینان سے کہہ سکتا ہوں کہ ان جیسے درویش صفت انسان پھر نظر نہ آئے۔ آپ کو علم ہے

کہ بعد میں خاکسار اللہ کے بے پایاں لطف و کرم سے دارالعلوم دیوبند، جامعہ ازہر قاہرہ اور کیمبرج بھی گیا۔ ایک نئی دُنیا دیکھی لیکن یہ خدا مست لوگ جو اپنی آستینوں میں یدِ بیضا لیے بیٹھے تھے وہ پھر نظر نہیں آئے۔ مثلاً وہاں وہاں مفتی فقیر اللہ اور مولانا عبدالعزیز جیسے درویش خدا مست استاذ تھے۔ خاکسار نے مرحوم مفتی فقیر اللہ سے شیخ سعدی کی کتاب بوستان پڑھی۔ مفتی صاحب اپنی ذات میں انسان کامل تھے۔ وہ مولانا محمود حسن دیوبندی سے شرفِ تلمذ رکھتے تھے۔ متحدہ ہندوستان کی تاریخ میں جو چند لوگ پیدا ہوئے ہیں جنہیں خدا نے علم، عقل اور عشق سے نوازا تھا، اُن میں سے ایک مولانا محمود حسن دیوبندی تھے۔ اُن کی عظمت کا اندازہ اس بات سے لگائیں کہ ان کے حلقۂ ارادت میں مولانا حسین احمد مدنی، مولانا شبیر احمد عثمانی، مفتی کفایت اللہ دہلوی اور حکیم اجمل ایسے زعماء شامل تھے۔ مولانا ابوالکلام آزاد نے بھی اُن کی فراست اور دیانت کی تعریف کی ہے، حالانکہ اُن کے اعتراف کی گردن بہ قول اُن کے ''مغرور واقع ہوئی ہے''۔ مفتی صاحب مولانا محمود حسن کے شاگرد رہ چکے تھے۔ ان کی ایک بڑی خوبی یہ تھی کہ وہ کسی کے گھر کھانا نہیں کھاتے تھے، جب تک علم نہ ہو جاتا کہ اس کا رزق حلال ہے۔ ان کے ساتھ دوسرے استاد مولانا عبدالعزیز تھے، جن سے خاکسار نے سکندر نامہ پڑھا۔ عربی کی ابتدائی کتابیں خاکسار نے اُن سے پڑھیں۔ وہ مولانا انور شاہ کشمیری کے شاگرد تھے اور مولانا عبدالعزیز کے والد حافظ محمد صالح مولانا رشید احمد گنگوہی کے خلیفہ تھے۔ گویا تیسرے واسطے سے خاکسار کا تعلق ''کعبہ سے ہے''، یعنی مولانا رشید احمد گنگوہی اور مولانا محمود حسن سے۔ اس داخلی احساس نے اس نامراد کو بہت کچھ دیا ہے۔ مولانا عبدالعزیز، بڑی محبت سے پڑھاتے تھے۔ میرا لڑکپن تھا، کبھی جاتا کبھی نہ جاتا۔ کہنے لگے ''تم شیطان ہو، مجھ سے پڑھو۔''

خالد صاحب! ان میں جو چیز خاکسار نے سب سے بڑھ کر دیکھی وہ اُن کا احساسِ ذمہ داری تھا۔ خدا کے ہاں جوابدہی کا احساس ان پر غالب رہتا تھا۔ آج جب ہم طبقہ علماء یا ''فرقہ زہاد'' کو دیکھتے ہیں، تو بہت بدلی ہوئی صورت پاتے ہیں۔ بعض یقیناً اچھے ہیں، لیکن اکثریت محض نعرہ بازی سے کام لینے والی ہے۔ آج جو سالانہ جلسے ہوتے ہیں تو اُن کا مقصد چندہ جمع کرنے کے علاوہ اور کچھ نہیں ہوتا لیکن ہمارے مدرسے کے علماء ان بکھیڑوں میں پڑنے والے نہ تھے۔ نہ کبھی کسی سے جا کر پیسے مانگتے تھے اور نہ ہی اخبار واشتہار کو پسند کرتے تھے۔ یعنی عجیب وغریب تھی اُن کے صدق وصفا کی کہانی۔ اگر آپ اس سے پیچھے چلے جائیں تو پتہ چلے گا کہ جن لوگوں نے ہندوستان میں اسلام کی تبلیغ واشاعت کا کام انجام دیا، وہ سادگی، خلوص اور قناعت کی چلتی پھرتی تصویریں تھیں۔ حضرت شیخ مُعین الدین چشتیؒ کی مثال لے لیں کہ راجپوتانہ میں اکیلے آئے تھے، عمر بھر کٹیا میں رہے، ان کے اردگرد راجپوت قبیلے آباد تھے، لیکن ڈر یا خوف سے بے خبر رہے۔ چونکہ ذہن میں اعتماد کی شمعیں روشن تھیں اور خدا سے تعلق گہرا تھا، ان کی مساعی سے جو اسلام پھیلا اس کے اثرات ہمہ گیر تھے۔ یہی بات خاکسار نے ان اساتذہ میں پائی۔ وہ کبھی پروپیگنڈہ نہیں کرتے تھے۔ جب ہم نے جامیؒ کی یوسف زلیخا پڑھی تو انہی مفتی فقیر اللہ کے بیٹے مولانا عبداللہ سے پڑھی۔ ہم دس یا گیارہ طالب علم تھے۔ جب جامی کی نعت آئی جس کا پہلا شعر ہے:

ز مہجوری برآمد جان عالم
ترحم! یا نبی اللہ ترحم

مجھے یاد ہے کہ پڑھانے سے پہلے اُستادِ مرحوم (مولانا عبداللہ) نے سب لڑکوں سے کہا کہ وہ وضو کر لیں اور پھر یہ نعت پڑھیں۔ پاکیزگی کا یہ عالم تھا۔ بات کہنے

کی نہیں، لیکن بتائے دیتا ہوں کہ یہ اسی وضو کا یا اُن مولویوں کی مسیحا نفسی کا اثر ہے کہ آج جب کبھی شیخ ابنِ عربی کو پڑھتا ہوں تو اکثر باوضو ہو کر پڑھتا ہوں اور ان مولوی صاحبان کو دُعائیں دیتا ہوں کہ تحصیلِ علم کے کتنے اچھے آداب ہمیں سکھا گئے۔

سوال: کیا وہ وعظ و نصیحت نہیں کرتے تھے؟

جواب: وہ وعظ و نصیحت سے زیادہ اپنے کردار سے دوسروں کو متاثر کرتے تھے۔ اُن کی شخصیتیں ایک خاص سانچے میں ڈھلی ہوتی تھیں۔ اُن کے چہروں پر ایک رونق ہوتی۔ کسی کی برائی نہیں کرتے تھے۔ جب نماز کا وقت آتا تو سب کو نماز کی طرف بلا لیتے۔ کوئی ساتھی لیٹ ہو جاتا تو اسے ڈانٹ دیتے تھے۔

سوال: تو آپ نے وہاں سے درسِ نظامی کی تکمیل کی؟

جواب: پورا درسِ نظامی نہیں پڑھا۔ اپنے گاؤں کے بعد جالندھر شہر میں خیر المدارس میں داخل ہو گیا۔ مولانا مرحوم خیر محمد مدرسہ کے ناظم تھے آپ مولانا اشرف علی تھانوی کے مرید باصفا تھے اور بڑے اچھے منتظم۔ وہاں سے دارالعلوم دیوبند پہنچ گیا اور مولانا سید حسین احمد مدنی اور مولانا محمد طیب جیسے اہلِ نظر اور خدا پرست علماء سے خدا پرستی اور انسان دوستی کا سبق لیا۔ یہ خدامست درویش علما پیکر صدق و صفا تھے۔ اب انہیں کہاں تلاش کریں۔ میرے والد صاحب مولانا حسین احمد مدنیؒ کے معتقد تھے۔ تقسیم سے پہلے خاکسار دارالعلوم دیوبند چلا گیا۔

سوال: یہ کب کی بات ہے؟

جواب: یہ سنہ ۴۵ء کے دن تھے۔ دارالعلوم دیوبند کی مسجد میں ایک بڑا اجلاس ہوا۔ پتہ چلا کہ مولانا ابوالکلام آزاد جیل سے رہا ہو گئے ہیں۔ اس اجلاس میں مولانا حسین احمد مدنیؒ نے تقریر کی۔ مولانا حسین احمد نے ابوالکلام آزاد کا اپنے نظریہ سے پیمانِ وفا

اور استقامت کا ذکر کرتے ہوئے کہا کہ سیاست میں مولانا محمد علی جوہر جیسے رہنما کے پاؤں ڈگمگا گئے تھے، اس کی ایک وجہ اُن کے بھائی شوکت علی تھے۔ مولانا حسین احمد مدنی کے بارے میں جیسا سنا تھا ویسا ہی انہیں پایا۔ بہت سادہ طرزِ زندگی تھا، اُن کا لباس بہت اُجلا تھا۔ ان دنوں مدرسہ کے مہتمم قاری محمد طیب تھے۔ قدرت نے انہیں جہاں ظاہری حسن سے نواز رکھا تھا، ایسے ہی داخلی حسن سے بھی نوازا تھا۔ باجماعت نماز میں قرأت کرتے تو اُن کے مقتدی جھوم جھوم اُٹھتے۔ عجیب لحن پایا تھا۔

سوال: اور مولانا شبیر احمد عثمانیؒ؟

جواب: وہ بھی اس وقت وہیں دیوبند میں تھے۔ ان کی طبیعت اکثر ناساز رہتی۔ خاکسار اور مرحوم حکیم محمد شریف جمعہ کے دن اُن کے گھر چلے جاتے اور وہ بستر پر لیٹے لیٹے وعظ فرماتے تھے۔ مدرسہ میں ایک اور درویش عالم پشاور سے وہاں آئے تھے۔ مولانا عبدالحق۔ آج کل اُن کا مدرسہ اکوڑہ خٹک میں ہے، اُن سے ہم نے مشکوٰۃ پڑھی تھی۔ افتتاح کے لیے مولانا حسین احمد مدنیؒ کو بلایا گیا۔ مولانا مدنی نے وہاں جو تقریر کی، وہ آج بھی میرے حافظے میں محفوظ ہے۔ فرمایا یہ دُنیا ہے اسے حسرت کی نگاہ سے نہ دیکھو۔ اس بات پر خدا کا شکر ادا کیا کرو کہ اس نے تمہیں اپنے دین کی خدمت کے لیے چن لیا ہے۔ مہمان نواز بہت تھے۔ مہمانوں سے ملاقات کے لیے گیارہ بجے کا وقت تھا۔ چائے پلائی جاتی تھی۔ بعض طالب علم حصولِ تبرک کے لیے جن میں حکیم محمد شریف اور خاکسار بھی تھے، مولانا کے ہاں چائے پیتے۔

سوال: یہ جو اساتذہ تھے، اُن کی تنخواہوں وغیرہ کا معاملہ کیسا ہوتا تھا؟

جواب: زندگی آج کی طرح وبالِ جان نہیں بنی تھی۔ تھوڑی تنخواہ بھی کافی ہوتی۔ پھر یہ لوگ ''کھانے'' کے لیے زندگی بسر نہیں کرتے تھے۔ مولانا شبیر احمد عثمانیؒ سے ہم

نے تصوف کے اسرار و رموز سنے۔ اس موضوع پر وہ بہت اچھا بولتے تھے۔ ۱۹۴۷ء میں ہم مشکوٰۃ کا درس لے رہے تھے، شعبان میں ہم گھر آئے، اگست کا مہینہ تھا کہ ہندوستان تقسیم ہو گیا۔ پنجاب بھی بٹ گیا۔ نکودر کی تحصیل میں کثیر آبادی مسلمانوں کی تھی، اس لیے گمان یہی تھا کہ یہ علاقہ پاکستان میں آئے گا، لیکن ایسا ہوا نہیں۔ قتل و غارت گری کے اس طوفان میں ہم پاکستان آئے۔ تین یا چار ماہ کیمپوں میں رہے۔

سوال: کیمپوں کی زندگی کیسی تھی؟

جواب: اس موضوع کو نہ چھیڑیے تو بہتر ہے، کیونکہ مشرقی پنجاب کی مسلم آبادی جس ہولناک عذاب سے گزری ہے، وہ ہماری تاریخ کا ایک دردناک باب ہے۔ تیرھویں صدی میں فتنہ تاتار کے ہاتھوں بغداد پر جو قیامت ٹوٹی تھی، اس کی تفصیل تاریخ الکامل میں ملتی ہے۔ اس کا مصنف اس وقت وہاں موجود تھا۔ وہ لکھتا ہے ''مجھ سے دوستوں نے بار بار کہا ہے کہ مَیں اس (قیامت) کا حال لکھوں، لیکن مَیں لکھنے پر آمادہ نہیں ہوتا تھا۔ بہرحال ان کے اصرار پر مَیں یہ حالات لکھ رہا ہوں۔ یہ ایک خدائی عذاب تھا جو سینٹرل ایشیا سے آیا تھا اور پھر پتہ نہیں کہاں کہاں تک پہنچا۔ مَیں اس دوران بار بار یہی کہتا تھا کہ کاش میری ماں نے مجھے نہ جنا ہوتا۔'' حقیقت یہ ہے کہ بغداد پر ٹوٹ پڑنے والی اس ہولناک مصیبت سے زیادہ ہولناک المیہ کا سامنا مشرقی پنجاب کے مسلمانوں نے کیا تھا۔ عورتیں قتل ہوئیں، اُن کی عزت و حرمت کو برسرِ بازار لوٹا گیا۔ بچے ذبح کر دیے گئے۔ غالباً دسمبر تک نکودر کیمپوں میں پڑے رہے۔ آخر خدا خدا کر کے پاکستان کی مقدس سرزمین میں داخل ہو گئے۔

سوال: دیوبند کی تعلیم مکمل ہو گئی تھی؟

جواب: نہیں، ابھی تکمیل نہیں ہوئی تھی۔ دوبارہ جانا تھا کہ یہاں پاکستان آ گئے۔ ایک تو مشرقی پنجاب میں قتل و غارت کا عذاب یا ابتلاء آیا، دوسرے عذاب کا سامنا یہاں ہوا۔ جو لوگ اُدھر جائیدادیں چھوڑ آئے تھے، اُن کے کلیم لوگوں نے داخل کرنے شروع کیے۔ جو جائیدادیں غیر مسلم یہاں چھوڑ کر اُدھر چلے گئے تھے، وہ سٹیٹ کی ملکیت تھیں۔ انہیں مہاجرین میں تقسیم کیا جانا تھا۔ اس عمل میں رشوت اور سفارش کا سلسلہ چل پڑا۔ یہ ہندو مسلم فسادات کی مصیبت سے کم مصیبت نہیں تھی کیونکہ یہاں رشوت اور سفارش کا سلسلہ دراز ہوتا چلا گیا۔ حتیٰ کہ ان برائیوں نے سارے معاشرے کو اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ میرے خاندان کے لوگ کہیں اور چلے گئے تھے۔ خاکسار اُن کی تلاش میں کئی ماہ تک مارا مارا پھرتا رہا۔ یہی وجہ ہے کہ خاکسار آج بھی پنجاب کے بہت سارے علاقوں سے واقف ہے۔ آخر وہ (والدین) شاہکوٹ (شیخوپورہ) کے ایک گاؤں 'کڑیال' میں مل گئے۔

سوال: تعلیم کا سلسلہ پھر کیسے شروع ہوا؟

جواب: ۱۶ر دسمبر ۱۹۴۹ء کو خاکسار جامعہ عباسیہ بہاولپور میں داخل ہو گیا۔ یہ سرکاری عربی کالج تھا جس کے کھنڈروں پر اب اسلامیہ یونیورسٹی بہاولپور بنی ہے، مرحوم جامعہ عباسیہ موجودہ یونیورسٹی سے ہزار درجے بہتر تھی۔ وہاں عربی کا کورس بہت عمدہ ہوتا تھا۔ پرنسپل مولانا محمد عبیداللہ تھے، جو بہاولپور کے رہنے والے تھے۔ سرائیکی بولتے تھے۔ بہت ہی نیک انسان تھے۔ وہ صحیح معنیٰ میں عالم اور عارف باللہ تھے۔ اُن کا دامنِ دل مذہبی فرقہ واریت کے ہر دھبہ سے پاک صاف تھا۔ جب خاکسار اُن کے پاس جامعہ عباسیہ میں گیا تو پوچھنے لگے، تم نے کیا پڑھا ہے؟ میں نے عرض کیا کہ جو پڑھا تھا، وہ بھول گیا ہوں۔ آپ مجھے الف۔ اے کے برابر کلاس میں داخل کر لیں۔ اگر پاس ہو گیا تو آپ رکھ لیں، ورنہ خارج کر دیں۔ اُنہوں نے اپنے

خاص انداز میں کہا، سائیں! تم پناہ گیر ہو؟ جی ہاں! پناہ گیر ہوں۔

اتفاق ایسا ہوا کہ خاکسار اچھے نمبروں سے پاس ہو گیا۔ مولانا مرحوم ایک بلند نظر اخلاقی انسان تھے، اُنہوں نے ڈائریکٹر تعلیمات (بہاولپور) سے کہا، یہ لڑکا پاس ہو گیا ہے، پناہ گیر ہے، اس کا وظیفہ لگا دیں۔ چنانچہ وظیفہ مل گیا۔ مرحوم مولانا عبیداللہ سے خاکسار نے حدیث کی کتاب ابوداؤد پڑھی۔ مولانا کو شیخ ابنِ عربی کی فتوحاتِ مکیہ پر عبور حاصل تھا۔ مولانا نے اجمیر میں مولانا مُعین الدین اجمیری سے پڑھا تھا۔ دہلی میں شیخ نظام الدین کی خانقاہ میں بھی رہے۔ مولانا بڑی خوبیوں کے مالک تھے۔ اب ''ڈھونڈ انہیں چراغ رخ زیبا لے کر''

سوال: تعلیم کے بعد پھر کیا مصروفیت رہی؟

جواب: خاکسار ۱۹۵۲ء میں وہاں سے فارغ ہو گیا۔ چھ ماہ تک بہاولپور کے ایک ہائی سکول میں عربی زبان کا ٹیچر رہا۔ پھر حکومت بہاولپور نے اعلان کیا کہ حکومت تین افراد کو اعلیٰ تعلیم کے لیے قاہرہ بھجوائے گی۔ چنانچہ جن بارہ آدمیوں نے درخواستیں دیں، اُن میں خاکسار سب سے کم عمر تھا۔ انٹرویو لینے والوں میں تین آدمی تھے۔ راؤ حفیظ الرحمٰن وزیرِ تعلیم، ڈائریکٹر ایجوکیشن بقا محمد اور پرنسپل جامعہ محمد ناظم ندوی۔ اتفاق یہ ہوا کہ اُنھوں نے میرا بھی انتخاب کر لیا۔ ہم بارہ اُمیدوار آفس سے باہر نتیجے کا اعلان سننے کے لیے منتظر بیٹھے تھے۔ وزیرِ موصوف کا نوکر آیا، اس نے کہا: وزیر صاحب اللہ بخش القادری اور رشید احمد نوں بلیندے پئے (بلا رہے ہیں)۔ ایک دوسرا اُمیدوار میرا ہم نام تھا، وہ اُٹھا، مجھ سے کہنے لگا تمہیں کون بلائے گا؟ خاکسار نے وزیر کے آدمی سے کہا، بھئی وزیر صاحب سے پوچھو رشید احمد بہاولپوری ہے یا رشید احمد پناہ گیر۔ چنانچہ وہ دوبارہ آیا اور ایک لمبی آواز سے پکارا ''پناہ گیر''۔ ہم اندر چلے گئے۔ وزیرِ موصوف نے کہا، ہم نے تمہارا انتخاب کر لیا

ہے، ہم نے سنا ہے کہ تم سٹالن وغیرہ کو پڑھتے ہو، یہ باتیں وہاں جا کر نہ کرنا۔

سوال: یہ سوشلسٹ لٹریچر آپ کو کہاں سے مل جاتا تھا؟

جواب: ان دنوں سوویت یونین کا سفارت خانہ روسی رہنماؤں کی تقریروں کا اُردو ترجمہ شائع کرتا اور مفت تقسیم کرتا تھا۔ میرا خیال ہے کہ یہ کتابیں مجھے اپنے ایک ذہین اور متحرک ہم جماعت مضطر عباسی سے ملتی تھیں۔ علامہ اقبال مرحوم کی معروف نظم: ''لینن خدا کے حضور'' (بالِ جبریل) مجھے اب بھی یاد ہے۔

سوال: یعنی آپ نے کوئی سفارش وغیرہ نہیں ڈھونڈی؟

جواب: دو باتیں تھیں، ایک تو یہ کہ میرے پیچھے کوئی سفارشی نہیں تھا، کوئی رشتے دار نہ تھا، اُنہوں نے خالص میرٹ کی بنیاد پر خاکسار کا انتخاب کیا۔ حالانکہ نئے پرنسپل صاحب سے میرے اختلافات تھے، لیکن اُن کی (محمد ناظم ندوی مرحوم) شرافت دیکھئے، اُنھوں نے کہا، مَیں اس لڑکے کے بعض افکار کو ناپسند کرتا ہوں لیکن یہ ذہین ہے، مَیں اس کی راہ میں رکاوٹ نہیں بننا چاہتا۔

انٹرویو اور اعلان کے بعد پرنسپل خود اُٹھ کر میری طرف آئے اور کہنے لگے، تمہاری اَنا---تمہاری راہ میں رکاوٹ بن گئی۔ منتخب ہونے پر میری طرف سے مبارکباد اور شام کا کھانا تم میرے گھر کھاؤ گے۔ یعنی یہ تھے وہ لوگ جو تعصب، فرقہ واریت اور نفرت سے بالاتر تھے۔ آج کوئی تصور کر سکتا ہے کہ وزیرِ تعلیم نے ایک 'پناہ گیر' غریب طالبعلم کا انتخاب کیا ہوگا۔ گورنمنٹ نے ہمیں بحری جہاز کے سفر کے لیے پانچ سو روپیہ دیا۔ جب کراچی پہنچے تو معلوم ہوا کہ برطانیہ کی ملکۂ معظّمہ کی تاج پوشی کی وجہ سے بحری جہاز میں جگہ نہ تھی۔ ہوائی جہاز سے جانے کا کرایہ ہماری جیبوں میں نہ تھا۔ اچانک مرحوم مخدوم زادہ حسن محمود کراچی آ گئے۔ ہم دونوں اُن سے ملے۔ دوسرے ساتھی مرحوم اللہ بخش القادری بہاولپور کے رہنے

والے تھے۔ اُنہوں نے مجھ سے کہا کہ تم تقریر بہت جھاڑتے ہو۔ تم ہی حسن محمود کے سامنے تقریر جھاڑو--- چنانچہ خاکسار نے وزیرِ موصوف کے سامنے ایک تقریر کی۔ کہنے لگے، تم بہاولپور کے ہو یا پناہ گیر؟ جی! مَیں پناہ گیر ہوں۔ کہنے لگے، کل آ جانا، مزید پانچ سو روپے لے لینا اور ہوائی جہاز سے مصر چلے جاؤ۔ چنانچہ ہم دونوں نے ان کے سیکرٹری سے پیسے لیے اور برٹش ایئر لائنز کے طیارے سے قاہرہ پہنچے۔ اسے کہتے ہیں: ''تو جو چاہے تو اُٹھے سینۂ صحرا سے موجِ حباب''

سوال: آپ کے ساتھ دوسرے آدمی کون تھے؟

جواب: میرے دوسرے ساتھی جو بہاولپور کے رہنے والے تھے، اللہ بخش القادری تھے، وہ ذہین آدمی تھے۔ کوئی ایک سال ہوا وفات پا گئے ہیں۔ خدا اُن کی مغفرت فرمائے۔ رحیم یار خان کالج میں عربی پڑھاتے تھے۔ خوش باش طبیعت کے مالک تھے۔ عربی کے علاوہ فارسی بھی جانتے تھے۔ بڑی میٹھی سرائیکی بولتے تھے۔ میں سرائیکی بولتا تو نہیں لیکن پوری طرح سمجھتا ضرور ہوں اور اس کی فصاحت، بلاغت اور داخلی سوز و گداز سے لطف اندوز بھی ہوتا ہوں۔ خاص طور سے حضرت خواجہ غلام فریدؒ کی کافیاں سنتا ہوں۔ یوں محسوس ہوتا ہے کہ روح نے اپنی بھولی ہوئی منزل کا سراغ پا لیا ہے۔

صحیح بات یہ ہے کہ خاکسار مرحوم ریاست بہاولپور کا بڑا مقروض ہے۔ افسوس! ۱۹۵۶ء میں 'ون یونٹ' کے نام پر بہاولپور کو پنجاب نے ہضم کر لیا۔ جس سے بہاول پور کی ترقی رُک گئی۔ واقعہ یہ ہے کہ والیانِ بہاول پور نے پاکستان کے ساتھ الحاق کر کے اہلِ پاکستان اور خاص طور پر اہلِ پنجاب پر بڑا احسان کیا تھا۔

سوال: کیسا لگا آپ کو مصر؟

جواب: نیا ماحول تھا، نئی تہذیب دیکھنے کا موقع ملا۔

سوال: یہ شاہ فاروق کا دَور تھا؟

جواب: نہیں، جنرل محمد نجیب صدر تھے اور جمال عبدالناصر روحِ انقلاب۔ ہم ۱۹۵۳ء میں قاہرہ گئے تھے۔ ناصر ۱۹۵۲ء میں برسرِ اقتدار آئے تھے۔ جناب اللہ بخش تو واپس آ گئے لیکن خاکسار ٹھہرا رہا اور ۱۹۵۵ء میں جامعہ الازہر سے فارغ ہوا۔

سوال: کیا ڈگری لی؟

جواب: ایم۔اے کیا تھا، کلیہ اللغۃ العربیۃ سے تدریس میں۔ شروع میں ہم فیل بھی ہو گئے تھے۔ پتہ نہیں تھا، ان کی بولی سمجھنے کا بھی ذرا مسئلہ تھا کیونکہ ہم ادھر سے ہندی نوعیت کی عربی درسِ نظامی میں پڑھ کر گئے تھے۔

سوال: یعنی ان کی عام بول چال کی زبان بہت مختلف تھی؟

جواب: جی ہاں! ایک دفعہ مفتی محمود صاحب نے بتایا کہ مَیں نے ان لوگوں کی عربی سنی تو سر پکڑ لیا۔ خاکسار نے کہا، اُن کا بھی یہی حال ہوتا ہے۔ کہنے لگے، وہ کیسے؟ خاکسار نے کہا، وہ اس طرح کہ جب وہ ہماری عربی سنتے ہیں تو وہ بھی سر پکڑ لیتے ہیں۔ ہمارا پاکستانی یا ہندوستانی لب ولہجہ ہی دوسرا ہوتا ہے۔ مفتی صاحب کہنے لگے، تم بالکل ٹھیک کہتے ہو۔ خیر جب ۱۹۵۵ء میں فارغ ہوا تو مصری براڈکاسٹنگ سسٹم کے اُردو پروگرام میں کام مل گیا۔ یہ پروگرام پہلی دفعہ شروع ہو رہا تھا۔ قاہرہ میں مرحوم صدر جمال عبدالناصر کے ایک پاکستانی دوست حامد حسن خان تھے۔ وہ وہیں مقیم ہو چکے تھے۔ ان کی ناصر سے انقلاب سے پہلے کی دوستی تھی۔ ان کا کہنا تھا کہ ابھی کچھ دیر اور ٹھہر جاؤ، چنانچہ خاکسار نے تین چار سال تک وہاں ٹھہرنے اور مطالعہ کرنے کا پروگرام بنا لیا۔

سوال: کیا جمال عبدالناصر کو بھی دیکھا؟ ایسے ہی ڈاکٹر طٰہٰ حسین یا کسی اور مصری دانشور کو؟

جواب: جمال عبدالناصر سے ملاقات ایک تقریب میں ہوئی تھی۔ پہلے یہ بتا دوں کہ مصر

کے قیام کے دوران خاکسار نے ڈاکٹر احمد امین اور ڈاکٹر طٰہٰ حسین کو مقدور بھر پڑھ لیا تھا۔ طٰہٰ حسین کی تو تقریر بھی سنی۔ خاکسار نے زندگی میں جو چند عمدہ تقریریں سنی ہیں، اُن میں سے ایک تقریر ڈاکٹر طٰہٰ حسین کی بھی ہے۔

وہ حضرت عمر فاروقؓ کا خصوصی مطالعہ رکھتے تھے۔ جب وہ تقریر کرتے تو قاہرہ کی سڑکیں بند ہو جاتی تھیں، اتنا ہجوم ہوتا تھا اُن کے سامعین کا۔ ڈاکٹر احمد امین نے لکھا تھا کہ ''جب ڈاکٹر طٰہٰ حسین تقریر کرتے ہیں تو یوں محسوس ہوتا ہے جیسے اُن کے سامنے ایک آسمانی کتاب دھری ہے اور فرشتوں کی انگلیاں اس کے اوراق اُلٹ رہی ہیں۔'' وہ نابینا تھے لیکن ترقی کی منزلیں طے کرتے بہت آگے نکل گئے تھے۔ اُن کی آواز میں ایک وقار تھا اور تمکنت۔ جمال عبدالناصر پر کوئی تنقید نہیں کر سکتا تھا، لیکن طٰہٰ حسین تنقید کر سکتے تھے۔ ناصر کا کہنا تھا یہ ہمارا قومی اثاثہ ہے جو جی چاہے کہے۔ طٰہٰ حسین کہتے تھے کہ ہمارے پیٹ اور حلق کے علاوہ ایک تیسری چیز عقل بھی ہے جو غذا مانگتی ہے۔ نعروں سے پیٹ نہیں بھرتا، عقل سے کام لینا سیکھو۔ جن خطوط پر آج ہماری مصری سوسائٹی چل رہی ہے، اُن کو چھوڑ دو۔ اسی طٰہٰ حسین کو دورِ طالبعلمی میں علماءِ ازہر نے جامعہ سے نکال باہر کیا تھا، لیکن یہ عجیب اتفاق ہے کہ جب وہ ایک انٹرنیشنل کانفرنس میں شرکت کے لیے روم گئے تو اُنہوں نے دورانِ تقریر وہاں چند حدیثوں کا اطالوی زبان میں ترجمہ پڑھا تو کچھ مسیحی راہبات (Nuns) ان کے پاس آئیں۔ اُنہوں نے کہا کہ یہ حدیثیں اپنے اندر بہت عمدہ مطالب رکھتی ہیں، کیا ہمیں اجازت ہوگی کہ ہم ان حدیثوں کو اپنی دُعاؤں میں پڑھیں؟ اس پر علمائے ازہر نے انہیں مبارکباد کا خط لکھا تھا کہ تم نے عجیب وغریب کام کیا ہے۔ قاہرہ میں ایک مشہور کتاب چھپی تھی ''تحت رایۃ القرآن'' جو مصطفیٰ الرافعی کے قلم سے ہے جو طٰہٰ حسین کا حریف تھا۔ ۱۹۲۹ء میں مصر کی اسمبلی میں بحث

ہوئی تھی کہ طٰہٰ حسین ملحد ہے، اسے یونیورسٹی سے الگ کر دیا جائے۔ وہ الگ بھی ہو گئے تھے۔ اتفاق دیکھئے کہ ایک وقت کے بعد طٰہٰ حسین وزیرِ تعلیم بن گئے۔ جب وہ قاہرہ یونیورسٹی گئے تو چند طالبعلموں نے نعرے لگائے اندھا اندھا واپس جاؤ۔ طٰہٰ حسین نے کہا بلاشبہ میری ظاہری آنکھیں نہیں، ہاں! میرے دل کی آنکھیں کھلی رہتی ہیں۔ صد شکر کہ تمہیں دیکھ نہیں پاتا۔ جب وہ یونیورسٹی میں استاد تھے تو اسی مصطفیٰ الرافعی کی بیٹی نے وہاں داخلہ لیا۔ اسے تشویش تھی کہ پتہ نہیں کیا سلوک ہو؟ بہرحال اُس نے بتا دیا کہ میں مصطفیٰ الرافعی کی بیٹی ہوں تو طٰہٰ حسین نے کہا، آپ میری بھی بیٹی ہیں۔ آپ کو معاشی مدد کی ضرورت ہو تو مَیں تمہارا وظیفہ لگوا دوں گا۔ میرا تم سے نہیں مصطفیٰ الرافعی سے اختلاف تھا۔ لیکن رات گئی، بات گئی۔ اتنا بلند نظر انسان تھا وہ!

سوال: اور کون سے رائٹر لوگ تھے وہاں؟

جواب: عباس محمود العقاد تھا لیکن خاکسار ڈاکٹر احمد امین سے بہت متاثر تھا۔ ان کا ایک ساتھی: عبادی بھی تھا۔ ان تینوں نے باہم طے کیا کہ احمد امین اسلام کی ''سوشل تاریخ''، طٰہٰ حسین ''اسلام کی ادبی تاریخ'' اور عبادی اسلام کی ''سیاسی تاریخ'' لکھیں گے۔ احمد امین نے نو جلدیں لکھیں جو ایک کارنامہ ہے، بڑی مقبول ہوئیں۔ طٰہٰ حسین نے ادبی کتابوں کے علاوہ حضرات شیخین پر یعنی حضرت ابوبکر صدیقؓ اور حضرت عمرؓ بن خطاب پر کتابیں لکھیں۔ حضرت عثمانؓ اور حضرت علیؓ پر الفتنۃ الکبریٰ کے نام سے کتاب لکھی۔ پہلے دو خلفاء پر کتاب اس حوالے سے اہم ہے کہ اس میں طٰہٰ حسین نے بتایا کہ ان خلفاء کرام نے اجتماعی انصاف قائم کرنے کے لیے کیا کیا تجربے کیے۔ طٰہٰ حسین نے لکھا ہے کہ اگر رسول اکرمؐ مکہ مکرمہ میں صرف توحید کی دعوت دیتے تو قریشِ مکہ مان جاتے لیکن آپ توحید کے ساتھ

ساتھ معاشی انصاف کی بھی دعوت دیتے تھے جو کفارِ مکہ پر گراں گزرتی تھی۔ وہ اپنے بتوں، معبودوں سے مخلص نہیں تھے۔ اگر صرف توحید کی دعوت ہوتی تو وہ قبول کر لیتے۔ ابنِ ہشام نے لکھا ہے کہ قریش کے بڑے بڑے چودھری آنحضرت ﷺ کے پاس آئے اور کہا: اگر آپ ان غلاموں کو باہر نکال دیں تو ہم آپؐ کے ساتھ بیٹھیں گے یا ایسے ہی آپ کو مکہ کی فیصلہ ساز کونسل میں بھی شامل کر لیں گے۔ آپ اپنی محفل میں اپنے غریب ساتھیوں کو بیٹھنے نہ دیں۔ لیکن آنحضرت ﷺ نے قریش کی اس پیشکش کو مسترد کر دیا۔ طٰہٰ حسین لکھتے ہیں کہ حضرت عمر فاروقؓ اپنے دورِ خلافت کے آخر میں فرماتے تھے: ''جن باتوں کا مجھے آج پتہ چلا ہے، اگر پہلے پتہ چل گیا ہوتا تو مَیں دولتمندوں کی زائد دولت چھین لیتا اور غریبوں میں تقسیم کر دیتا۔'' اس پر طٰہٰ حسین نے لکھا کہ حضرت عمرؓ جس مثالی انصاف کا تجربہ کر رہے تھے، وہ تجربہ ابھی نامکمل ہی تھا کہ آپ کو شہید کر دیا گیا۔

سوال: کئی روایات ایسی ہیں کہ جن سے پتہ چلتا ہے کہ حضرت عمرؓ سوسائٹی کو معاشی طور پر غیر متوازن ہونے سے روکنے کے لیے گہرے غور و فکر میں ڈوبے رہتے تھے۔

جواب: واقعہ یہ ہے کہ حضرت عمرؓ صحیح معنی میں عبقری انسان تھے۔ جب فتوحات کے نتیجے میں مصر اور ایران کی دولت مدینے آئی تو آپ نے فرمایا: ''کاش ایران اور مدینہ کے درمیان آگ کا دریا حائل ہوتا۔''

واقعہ یہ ہے کہ اگر مسلم دُنیا کے یا ہمارے حکمران، بابر، اکبر، شیر شاہ سوری کی تاریخ کے ساتھ ساتھ حضرت عمرؓ کی تاریخ کو غور سے پڑھ لیتے اور تاریخ کے تقاضوں کا بھی لحاظ رکھتے تو وہ سوسائٹی کے لیے بہت کچھ کر سکتے تھے۔ غرضیکہ جہاں تک ممکن ہوا خاکسار نے طٰہٰ حسین اور دوسرے مصری اہلِ علم کی تحریروں سے استفادہ کیا۔

سوال: مرحوم جمال عبدالناصر سے بھی ملنا ہوا؟

جواب: ہاں ملنا ہوا۔ مَیں بتا رہا تھا کہ حامد حسن، ناصر کے دوست تھے۔ ۱۵/اکتوبر ۵۴ء کو اسکندریہ میں ناصر پر قاتلانہ حملہ ہوا جس میں وہ بچ نکلے۔ جب حامد حسن ناصر کو مبارک باد دینے گئے خاکسار اور محمد علی ان کے ہمراہ تھے۔ محمد علی مصر میں مقیم پاکستانیوں کی یونین کے صدر تھے۔ اصل میں یہ لوگ برطانوی فوج کے ساتھ رہتے تھے اور کاروبار کرتے تھے۔ غرض جب ہم قصرِ جمہوریہ میں پہنچے تو ہم ناصر سے ملاقات کرنے والوں کی قطار میں لگ گئے۔ پہلے نمبر پر سوڈان کے ایک صاحب تھے، دوسرے نمبر پر مفتی فلسطین امین الحسینی تھے، اُن کے ساتھ ان کا سیکرٹری، تیسرے نمبر پر حامد حسن، محمد علی اور خاکسار۔

سوال: ناصر کی شخصیت کیسی لگی؟

جواب: ناصر کا قد لمبا تھا۔ رنگ قدرے سانولا تھا۔ وہ بالائی مصر کے رہنے والے تھے۔ خاکسار نے انہیں غور سے دیکھا تو یوں نظر آیا کہ وہ عقابی نگاہوں کے مالک ہیں۔ چنانچہ اُن کی آمد کے ساتھ ہی سوڈانی ممبر نے ناصر کو مبارکباد پیش کی کہ وہ قاتلانہ حملے سے بچ نکلے۔ ناصر نے سوڈانی کی تقریر غور سے سنی، کیونکہ ان دنوں سوڈان سرکاری طور پر مصر سے الگ نہیں ہوا تھا۔ وحدت کا مسئلہ چل رہا تھا اُن کے بعد مفتی فلسطین کی باری تھی۔ اُنہوں نے قصیدہ مدحیہ پڑھنا چاہا لیکن ناصر نے انہیں روک دیا۔ ناصر نے کہا، یہ قصیدہ خوانی رہنے دیں، آپ میرے لیے فقط دُعا کریں، اس قسم کے قصیدے لکھنے اور پڑھنے میں پہلے ہی ہم نے بہت وقت ضائع کر دیا ہے۔

سوال: یعنی ناصر عملی سوچ رکھنے والا رہنما تھا؟

جواب: بے شبہ! وہ عملی اور انقلابی آدمی تھا، جس نے مغربی سیادت کو چیلنج کیا تھا۔ آپ یہ

ساری باتیں برطانیہ کے سابق وزیراعظم انتونی ایڈن کی کتاب میں پڑھ سکتے ہیں۔ اس نے ۱۹۵۶ء میں مصر پر حملہ کیا تھا۔ ناصر ۱۹۷۰ء میں وفات پا گئے۔ آج پوری عرب دُنیا کا پٹرول مغرب کے قدموں میں ہے۔ کوئی نہیں جو مغرب کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بات کر سکے۔ ناصر کیا گئے، پورا چمن برباد ہو گیا اور تو اور

''مجنوں جو مر گیا ہے تو جنگل اُداس ہے''

اس نے مصری سوسائٹی میں زبردست انقلابی تبدیلی پیدا کر دی تھی۔ خاکسار ۱۹۵۸ء میں فلسطین گیا تو دیکھا کہ اسرائیل کی ساری زمین زیرِ کاشت آ چکی تھی لیکن جو علاقہ عربوں کے قبضے میں تھا وہ سراسر ویران پڑا تھا۔ غزہ میں روشنی برائے نام ہوتی تھی، کتاب پڑھی نہیں جا سکتی تھی۔ خاکسار نے ایک فلسطینی سے کہا، یہ تمہارے ساتھ ہی اسرائیل ہے، وہ لوگ دیکھو کتنا کام کرتے ہیں، تم بھی تو کچھ کرو۔ وہ کہنے لگا، پہلے لڑائی کر لیں، پھر کام کریں گے۔ خاکسار نے کہا معاملہ برعکس ہے۔ پہلے کام کرو، پھر لڑائی کرو۔ یہ لوگ (فلسطینی مہاجرین) خیموں میں رہتے تھے۔ وہاں کا گورنر کرنل الموجی تھا، اس نے مجھ سے کہا، تم فلسطینی مہاجرین سے متعلق بھارت کے جرائد میں مضامین لکھو، گورنر نے مجھے جمال عبدالناصر کی تصویریں اور پناہ گزینوں کے بارے معلومات دیں۔ چنانچہ خاکسار نے بھارت کے معروف سہ روزہ اخبار ''مدینہ'' بجنور میں چند مضامین لکھے۔ اصل مسئلہ ہے کام کرنے کا، منصوبہ بندی کرنے کا، غور و فکر کرنے کا، صرف گالیاں دینے سے یا نعرے لگانے سے کام نہیں چلتا۔ آج دیکھ لیں اسرائیل کہاں کھڑا ہے؟ اور ہمارے عرب بھائی کہاں ہیں؟ اسرائیل نے جتنی محنت کی ہے، یہ اسی کا نتیجہ ہے کہ اس کے تعلقات چین سے بھی ہیں، روس سے بھی۔ ہمارے لیے سبق یہ ہے کہ

دیانت داری سے سوچیں کہ پاکستان کی تعمیر و ترقی کے لیے آج تک ہم نے کتنی محنت کی ہے؟ اگر ہمارے دلوں میں واقعی عوام کے لیے دُکھ درد ہوتا، اپنی ذمہ داریوں کا احساس ہوتا تو آج خوفناک بدعنوانیوں کا شکار نہ ہوتے۔ خاکسار جب فلسطینیوں کے مصائب دیکھتا تو مجھے اپنی بے بسی کے دن یاد آ جاتے تھے۔

۱۹۸۴ء میں، خاکسار امریکہ میں تھا۔ ایک دن وہاں افغانستان پر روس کے مظالم دکھانے کے لیے ایک فلم دکھائی گئی۔ خاکسار نے چند ہولناک مناظر دیکھے اور پھر اُٹھ کر باہر آ گیا۔ ایک امریکن نے جو مجھے وہاں لے گیا تھا، کہا: ''تم کیوں اُٹھ کر باہر آ گئے؟'' میں نے کہا اس طرح کے مناظر میں نے تقسیم ہند کے دنوں میں اپنے مرحوم وطن مشرقی پنجاب میں دیکھے تھے، اس لیے مَیں یہ فلم دیکھ نہ سکا۔ تقسیم کے المیے پر کئی انگریزوں نے کتابیں لکھی ہیں۔ موسلے کی کتاب ہے ''دی لاسٹ ڈیز آف برٹش راج'' جو ان دنوں امرتسر میں تھا۔ اس نے امرتسر کے جو چشم دید حالات لکھے ہیں وہ آپ پڑھ نہیں سکتے۔ مصر میں مجھے اُردو کے ممتاز ادیب مالک رام مل گئے تھے۔ وہ ہندوستانی سفارتخانے سے وابستہ تھے۔ ان کے پاس انڈیا سے بہت کتابیں آتی تھیں۔ وہ ایک مہذب اور اخلاقی انسان تھے۔ اُن کے رکھ رکھاؤ سے کوئی اندازہ نہیں کر سکتا تھا کہ اُن کا تعلق مسلم خاندان سے نہیں ہے۔ وہ مجھ سے کہتے، اگر تم میرے گھر کھانا نہیں کھاتے تو کم از کم میرا روزہ اپنے ہاں افطار کرا دو۔ اُنہوں نے ایک دن مجھ سے کہا کہ تم پی ایچ ڈی کیے بغیر پاکستان نہ جاؤ۔ چنانچہ خاکسار، مالک رام کی مدد سے مصر سے لندن چلا گیا۔ ان کی وفات پر خاکسار نے 'المعارف' میں لکھا بھی تھا۔ بس اتفاق ہی سمجھئے کہ بستی کا ایک بے یارومددگار کہاں سے چلا اور کہاں پہنچ گیا۔ ان دنوں کیمبرج یونیورسٹی میں ادارہ مشرقِ وسطیٰ کے مشہور استاد پروفیسر آربری تھے۔ اُنہوں نے قرآن مجید کا

انگریزی میں ترجمہ بھی کیا ہے۔ وہ لندن میں ایک لیکچر دینے آئے۔ لندن اسلامک سنٹر میں ڈاکٹر عبداللطیف عوض نے ان سے میرا تعارف کرایا۔

خاکسار نے انہیں بتایا کہ خاکسار نے آپ کا ترجمہ پڑھا ہے، بعض مقامات پر سقم پائے جاتے ہیں۔ اُنہوں نے پوچھا مثلاً کہاں؟ تو خاکسار نے بعض ایسے مقامات کی نشاندہی کر دی۔ جس پر اُنہوں نے کہا کہ اگر تم کیمبرج آنا چاہو تو آ سکتے ہو۔ چنانچہ خاکسار ۱۹۶۴ء میں کیمبرج پہنچ گیا اور آربری کے ساتھ تفسیر پر کام کیا۔ ہمارے لوگوں کے رویے ایسے ہیں کہ کسی پر مثبت تنقید کرو تو مرنے مارنے پر تُل جاتا ہے۔

سوال: آپ نے قاہرہ کی ڈائری میں مولانا مودودیؒ کا بھی کہیں ذکر کیا تھا، اُن سے کیسے ملاقات ہوگئی؟ اُن سے آپ پہلے کبھی ملے تھے یا ان کا لٹریچر پڑھا ہوا تھا؟

جواب: بات یہ ہے کہ مولانا مودودیؒ قرآن مجید کی تفسیر (تفہیم القرآن) لکھ رہے تھے۔ وہ بعض ایسے مقامات کو دیکھنے کے لیے وہاں آئے تھے، جن کا ذکر قرآن مجید میں آتا ہے۔ چنانچہ وہ مصر کے علاوہ اردن بھی گئے، دوسرے علاقوں میں بھی گئے۔ قاہرہ آئے، غالباً ۱۹۶۰ء کے لگ بھگ کی بات ہے۔ خاکسار نے انہیں پہلے پڑھا نہیں تھا۔ صرف ''سیاسی کشمکش'' پڑھ رکھی تھی۔ وہ اپنی ذات میں ایک مہذب انسان تھے۔ ان سے ملاقات ہوئی تو ''چٹان'' کے لیے جو ڈائری لکھی اس میں اُن سے ملاقات کے تاثرات بھی لکھے۔ مولانا سے بہت عمدہ باتیں ہوئیں۔ بعض باتیں ڈائری میں نہ لکھ سکا۔ ان سے شیخ ابو محمد زہرہ ملنے آئے۔ وہ ایک معروف صاحبِ علم تھے، عربی زبان پر پوری دسترس تھی۔ ایک دن اُنہوں نے مولانا کو لطیفہ سنایا کہ ہمارے ہاں مصر میں قتل کا بدلہ لینا بہت ضروری سمجھا جاتا ہے۔ اگر مقتول کے ورثا خود بدلہ نہ لے سکیں تو اجرت پر کسی شخص سے قاتل کو قتل کرا دیتے ہیں۔

ایک بڑھیا کا خاوند قتل ہو گیا تو اس نے ایک آدمی کو بلایا، جو پیشہ ور قاتل تھا اور کہا میں ایک غریب عورت ہوں لیکن خاوند کے قاتل سے بدلہ بھی ضرور لینا چاہتی ہوں۔ اس لیے تم مجھ سے تھوڑے پیسے لے لو۔ اس نے کہا ''لا، لا، مَیں پیسے نہیں لوں گا۔ مَیں اسے ''خدا کے لیے قتل کر دوں گا۔'' اقتلہ لوجہ اللّٰہ مولانا مودودیؒ بہت لطف اندوز ہوئے۔ دوسرے دن مولانا مودودیؒ صاحب سے ملاقات ہوئی تو خاکسار نے اُن سے کہا، آپ نے بہت اچھا کیا کہ ان ممالک کا دورہ کیا کیونکہ براہِ راست مشاہدے سے کئی ایسی معلومات مل جاتی ہیں جو کتابوں میں نہیں ملتیں۔ خاکسار نے ان سے یہ بھی پوچھا، اب تک یعنی تقسیمِ فلسطین تک قرآن کے حوالے سے کہا جاتا تھا کہ یہودی تا قیامت ذلیل رہیں گے۔ ان کی حکومت یا ریاست نہیں بنے گی۔ یہ ریاست (اسرائیل) تو بن گئی۔ قرآن مجید تو سچی کتاب ہے، اس لیے اس کا مطلب یہ ہے کہ قرآن میں یہودیوں کے دورِ زوال یا خدائی غضب کی ہم جو تعبیر و تشریح کرتے رہے وہ ٹھیک نہیں ہے۔ وہ کہنے لگے ان پر تو خدا کا غضب نازل ہوا تھا۔ لیکن میں سمجھتا ہوں کہ یہ جو ساری دُنیا کے یہودی فلسطین میں اکٹھے ہو رہے ہیں تو قربِ قیامت یہ یہیں قتل ہوں گے۔ مجھے ذاتی طور پر ان کی اس بات سے اتفاق نہیں تھا۔ البتہ فلسطین یا بیت المقدس میں یہودیوں کے غرور و نخوت نے جو راہ اختیار کی ہے، اس کی آخری منزل جنگ ہے۔ یہ جو روایات میں آیا ہے کہ یروشلم کا ایک ایک پتھر کہے گا کہ میرے پیچھے یہودی چھپا ہوا ہے یا کئی سال پہلے عراق میں اشتہار چھپا ہے، کہ صلاح الدین ایوبی گھوڑے پر بیٹھا ہے، اس پر لکھا ہوا ہے کہ 'ہم پھر یروشلم پہنچ گئے ہیں'۔ (عدنا) یہ جذبہ ہے، جو زندہ رہتا ہے اور شکست کو نہیں مانتا۔ جمال عبدالناصر نے کہا تھا، عیسائی دو سو سال تک بیت المقدس پر قابض رہے، ہماری اُن سے جنگ رہی، بالآخر بیت المقدس

آزاد ہوا۔ ۱۹۶۷ء میں جنگ ہوئی، اس کے پیچھے مکمل طور پر امریکہ تھا۔ اس جنگ پر ایک ہندوستانی صحافی کرنجیا نے لکھا تھا کہ اسرائیل نے جو علاقے قبضہ میں لیے ہیں، وہ واپس کر دے تو دائمی امن قائم ہو جائے گا۔ لیکن اگر شکست ہو گئی، تو ایسی بات نہیں، پھر لڑائی ہوگی، ایک دن عربوں کا پلہ بھاری ہو جائے گا۔ کرنجیا نے مزید کہا کہ میں صلاح الدین ایوبی کی قبر پر گیا ہوں، لوگ وہاں جاتے ہیں اور فاتحہ پڑھتے ہیں اُن کی روح کے اندر وہی جنگ کا ولولہ ہے۔ یہاں اس بات کا ذکر بے جا نہ ہوگا کہ جمال عبدالناصر جب ۱۹۵۸ء میں دمشق گئے تو ایوبی کی قبر پر بھی گئے۔ اُنہوں نے قبر پر کھڑے ہو کر کہا تھا: ''ہم مغرب کے خلاف جہاد جاری رکھیں گے۔''

اس پر ٹائمز لندن نے لکھا تھا، ناصر مذہبی جذبات کو بھڑکانا چاہتا ہے۔ ناصر نے جواب میں کہا تھا: ؟

پہلی جنگِ عظیم کے خاتمے پر برٹش فوجوں کا کمانڈر، ایوبی کی قبر پر آیا اور کہا: ''صلاح الدین! آج صلیبی جنگیں ختم ہو گئیں۔''

فرانس کا کمانڈر آیا تو اس نے کہا: ''صلاح الدین! ہم دوبارہ بیت المقدس میں واپس آ گئے ہیں۔''

تو خاکسار عرض کر رہا تھا کہ سیّد مودودیؒ صاحب نے جو کہا تھا کہ یہودی دراصل اپنے مقتل کی طرف آ رہے ہیں، نظر آتا ہے یہودی سیاست کا مغرور رویہ یہودیوں کو قتل گاہ میں لا کھڑا کرے گا۔

۱۹۶۷ء کے المیہ پر خاکسار نے لندن کے ایک معروف انگریزی رسالے *Islamic Review* (اسلامک ریویو) میں اداریہ لکھا تھا۔ ایک دن ہم اسلامک سنٹر میں نمازِ جمعہ پڑھ رہے تھے، وہاں اُردن کا سفیر آیا۔ اس نے مرحوم

راجہ محمود آباد سے کہا، ''رشید کون ہے؟'' راجہ صاحب نے کہا ''کیوں؟'' اس نے کہا: ''اس نے ایک مضمون لکھا ہے کہ بیت المقدس پر یہودی حملے کا سبب خود اردن ہے، کیونکہ اردن کا دارالحکومت تو یروشلم ہونا چاہیے تھا۔ لیکن اس نے عمان کو اپنا صدر مقام کیوں بنایا؟ یہ یقینی ہے کہ پہاڑیوں سے صلاح الدین آنے والا ہے، اگر ہم تاریخ میں کوئی رول ادا کر سکتے ہیں، تو اپنا محاسبہ کرنا چاہیے۔ جب اردنی سفیر نے اپنی بات ختم کی تو راجہ صاحب نے میری طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا کہ یہ رشید ہے۔ سفیر نے مجھ سے کہا کہ تم نے جس جذبہ سے لکھا ہے، مَیں اس کی قدر کرتا ہوں۔ لیکن لب ولہجہ سخت ہے۔

بات دوسری طرف چلی گئی، خاکسار بتا رہا تھا کہ وہاں مولانا مودودیؒ سے ملاقات ہوئی، اُنھوں نے ۲۵ر جنوری ۱۹۶۰ء کو میری ڈائری پر اپنے دستخط ثبت کیے تھے۔ مالک رام کی ڈائری پر اُنھوں نے لکھا تھا: ''**لاتموتن الا انتم مسلمون**'' اب دیکھیں ان کی جو تفسیر ہے، اس میں ہر سورت سے پہلے سورت کا تعارف دیا گیا ہے، نقشے بھی دیے گئے ہیں، اس سے پہلے ارض القرآن کے نام سے سیّد سلیمان ندویؒ نے بھی کتاب لکھی تھی مگر سید مودودیؒ صاحب نے ان معلومات میں کافی اضافہ کیا ہے۔ بہرحال سیّد صاحب وہاں پہنچے، علماء سے ملے۔ علماء سے ملنے کے بعد افکار بدل جاتے ہیں۔ فائدہ ہی ہوا۔ ان کے جانے سے پہلے اُن کی بعض کتابیں عربی میں ترجمہ ہو چکی تھیں۔ مثلاً پردہ ہے، وہ دمشق سے شائع ہوئی۔ وہاں عربی زبان میں چھاپنے سے پہلے پبلشر کو خیال ہوا کہ وہاں کے ایک محدث (البانی) سے پوچھ لیں کہ کتاب میں احادیث سے جو استدلال کیا گیا ہے اُن کا کیا مقام ہے؟ پتہ چلا کہ جتنی حدیثوں سے استدلال کیا گیا ہے وہ ساری ضعیف ہیں۔ بہرحال انہیں ان مقامات کو دیکھ کر بہت فائدہ ہوا۔ القصہ خاکسار

نے انہیں گفتگو میں مہذب پایا۔ آخر دہلوی تھے اور وہ بھی مودود خاندان سے! خاکسار واپس آیا تو اوقاف کی شائع کردہ کتابیں انہیں بھجوائی تھیں، ساتھ ایک خط بھی لکھا۔ مولانا نے جواب میں لکھا ''تم سے تجدیدِ ملاقات کر کے دلی مسرت ہوگی۔'' ترجمان القرآن میں ان کتابوں پر تبصرہ بھی شائع ہوا تھا۔ ان کے مکتوبِ گرامی کے جواب میں خاکسار ان سے مئی ۱۹۷۲ء میں ملا تھا۔ ہاں! اس ملاقات میں مرحوم گلزار احمد مظاہری اور جعفر قاسمی بھی تھے۔ اس ملاقات کا تفصیل سے پھر کبھی ذکر کروں گا۔ یہ ''روشنی مطبع'' بالآخر بلا بنی۔ پیپلز پارٹی کی حکومت تھی، ایک مرکزی وزیر صاحب میرے خلاف تھے۔ اُنہوں نے گورنر سے کہہ کر مجھے فارغ کرا دیا۔ جب پنجاب اسمبلی میں مرحوم علامہ رحمت اللہ ارشد نے سوال اُٹھایا تو گورنر نے کہا وہ مجھ سے مل لیں۔ چنانچہ خاکسار گورنر صاحب سے ملا بھی تھا۔

اس ملاقات کے بعد ایک دوسری ملاقات نومبر ۱۹۷۸ء میں ہوئی۔ ان ملاقاتوں کا حال پھر کبھی تفصیل سے لکھوں گا، البتہ یہاں ایک بات کا ذکر کرنا مناسب ہوگا۔ مرحوم محمد اسد نے ۱۹۶۴ء میں اپنی انگریزی تفسیر کی پہلی جلد ہالینڈ سے شائع کی جو رابطہ عالم اسلامی مکہ کے اہتمام سے چھپی تھی۔ بعد میں چند مولوی صاحبان نے اس تفسیر کے خلاف ہنگامہ کھڑا کر دیا اور اسے بند کر دیا گیا۔ اس پر خاکسار نے ایک دوست کے کہنے پر ایک لمبا تبصرہ لکھا تھا جو لندن میں اسلامک سنٹر کے رسالہ ''اسلامک کوارٹرلی'' (ستمبر ۱۹۶۸ء) میں شائع ہوا تھا۔ اس تبصرہ میں خاکسار نے اس تفسیر کے محاسن اور دو ایک لغزشوں کا بھی ذکر کیا، جس پر محمد اسد نے مجھے شکریہ کا خط لکھا۔ خاکسار نے اس ملاقات میں مرحوم (سیّد مودودیؒ) سے پوچھا کہ اُنہوں نے اس تفسیر کے خلاف رابطہ عالم اسلامی کی پابندی کی تائید کی تھی۔ کیا آپ نے اس تفسیر کو پڑھا؟ اُنہوں نے جواب دیا، مَیں نے یہ ترجمہ

نہیں پڑھا، البتہ میں نے اپنے ساتھیوں پر اعتماد کر کے ان کے فیصلہ کی تائید کی تھی۔ یہاں پر یہ بھی عرض کر دوں کہ محمد اسد کا ترجمہ ۱۹۸۰ء میں مکمل طور پر شائع ہوا۔ خاکسار نے ۱۹۶۸ء میں ریویو لکھا تھا، جسے محمد اسد نے پسند کیا تھا اور مجھے ایک خط بھی لکھا تھا۔ وہ اب دوبارہ بھی شائع ہو گیا ہے۔ اس ترجمہ پر محمد اسد نے بہت محنت کی ہے۔ وہ عربی زبان سے پوری طرح واقف تھے، ایسے ہی یہودی روایات سے بھی۔ چنانچہ وہ اس ترجمہ و تفسیر میں کامیاب ہوئے۔

سوال: بات مولانا مودودیؒ کی ہو رہی تھی۔ ان سے ملاقاتوں کے بارے میں کچھ اور بتائیں۔

جواب: جیسا کہ خاکسار نے کہا کہ پاکستان میں ان سے میری طویل ملاقات مئی ۷۲ء میں ہوئی۔ پھر نومبر ۱۹۷۸ء میں ہوئی۔ میں ان کے بڑے بھائی مولانا ابوالخیر مودودیؒ سے ملنے گیا تھا۔ ان سے میری نیاز مندی تھی۔ وہ صحیح معنوں میں خودداری، نفاست اور تصوف کے شیدائی تھے۔ انہیں (سیّد ابوالاعلیٰ) بھی علم تھا کہ خاکسار ان کے بھائی سے ملتا ہے۔ جب خاکسار سیّد ابوالخیر سے ملنے گیا تو سیّد ابوالاعلیٰ کے بیٹے (سیّد حیدر فاروق) نے بتایا سیّد ابوالخیر صاحب تو نہیں ہیں، ہاں والد صاحب بیٹھے ہیں۔ اس وقت مولانا تکلیف میں تھے۔ پین کلر کھاتے تھے۔ چل پھر نہیں سکتے تھے۔ شاید پھر موقع نہ ملے، اس خیال سے اُن سے ملنے گیا۔ اس آخری ملاقات میں دیکھا کہ اُن کا چہرہ دمک رہا ہے۔ خاکسار نے اُن کی تکلیف پر اظہارِ افسوس کیا تو کہنے لگے، کوئی بات نہیں، اللہ کی مرضی ہے۔ یہاں یہ بتا دوں کہ مجھے اُن کی بعض تحریریں پسند نہیں تھیں، ان میں کسی حد تک تعلی بھی تھی۔ بعض باتیں بس باتیں ہی تھیں، لیکن اس آخری ملاقات میں مجھے شدت سے احساس ہوا کہ مولانا وادیٔ سیاست سے باہر نکل آئے ہیں۔ قرآن میں آیا ہے کہ جب آدمی

موت سے ہم کنار ہوگا تو حقیقت کے چہرے سے نقاب اُلٹ دیا جائے گا۔ مولانا کا دمکتا ہوا چہرہ، اور پُرسکون لب ولہجہ بتا رہا تھا کہ آخری سفر کے لیے گھنٹی کی آواز سن رہے ہیں۔ خاکسار نے عرض کیا کہ آپ نے اپنے ایک مضمون میں جو نوائے وقت میں چھپا ہے، جنرل ضیاء کی تائید کی ہے کہ مفتی لگا دیئے جائیں۔ میرا خیال ہے کہ اگر یہ مفتی آ گئے تو گویا ہم ایسٹ انڈیا کمپنی کی طرف جا رہے ہیں۔ مولانا نے کہا کہ وہ مضمون صحیح طور پر شائع نہیں ہوا۔ خاکسار نے اُن سے کہا کہ آپ کا اثر ہے، آپ کی ایک تنظیم ہے، ایک کتاب شائع ہوئی ہے، جس میں لکھا ہے کہ مذہب کوئی ہو خواہ وہ اسلام ہو، یہودیت ہو یا عیسائیت، بنیادی طور پر سرمایہ داری کا حامی ہے۔ اس نے آپ کا نام بھی لیا ہے کہ مودودیؒ صاحب اسلام کے سب سے بڑے داعی ہیں لیکن وہ قائل ہیں سرمایہ داری سسٹم کے۔ اگر آپ اس بات کی تردید فرما دیں، تو اُنہوں نے پوچھا، کس نے لکھا ہے۔ روڈی سن نے لکھا ہے۔ خاکسار نے کہا۔ جو ایک مشہور فرانسیسی سکالر ہے اور کمیونسٹ ہے، اس نے یہ کتاب فرنچ زبان میں شائع کی تھی بعد میں اس کا انگریزی میں ترجمہ بھی شائع ہوا۔ کہنے لگے تعجب ہے۔ مجھے اس کا علم نہیں۔ میرے ساتھیوں نے مجھے نہیں بتایا؟ اس ملاقات میں اور بھی باتیں ہوئیں جن کی تفصیل پھر کبھی بیان کروں گا۔ لیکن میرا تاثر ہے کہ ضیاء الحق کی حکومت میں اُن کی جماعت کے جو لوگ شامل ہوئے تھے، اس میں اُن کی (مولانا کی) رضامندی شامل نہیں تھی۔ صحیح بات یہ ہے کہ ضیاء الحق کی فوجی حکومت میں شامل ہو کر جماعتِ اسلامی کے رہنماؤں نے بتا دیا تھا کہ اس کا سیاسی قبلہ ''حجاز'' نہیں ''ترکستان'' ہے۔

یہاں یہ بات بھی قابلِ ذکر ہے کہ وہ اپنی تحریروں میں مولانا ابوالکلام آزاد کو مرحوم ابوالکلام لکھتے رہے ہیں لیکن ایک وقت آیا کہ عصر کے وقت جب اُن

کی نشست ہوتی تو کسی نے آزاد کے بارے میں پوچھا تو مولانا نے کہا: ''وہ تو ان شریف النفس لوگوں میں سے تھے جو گالیاں سننا تو جانتے ہیں دینا نہیں جانتے۔ اس قسم کے واقعات سے میرا اندازہ تھا کہ مولانا کی داخلی زندگی میں ایک نیا موڑ آ گیا ہے جو اکثر لوگوں کی نگاہ سے اوجھل رہا۔ مولانا سے آپ اختلاف کریں یا نہ کریں وہ بہرحال ایک مہذب اور کلچرڈ انسان تھے، لیکن اُن کی جماعت کی بدقسمتی ہے کہ اُنھوں نے اپنا کوئی جانشین نہیں چھوڑا۔

سوال: آپ مصر میں رہے، اخوان کی تحریک سے کبھی رابطہ رہا؟

جواب: خاکسار نے سیّد قطب کو دیکھا ہے۔ وہ ۱۹۵۵ء میں میرے ایک دوست سے ملنے پاکستانی ایسوسی ایشن کے دفتر آئے تھے۔ مَیں وہاں بیٹھا ہوا تھا۔ خاکسار نے اُن کی تفسیر بھی دیکھی ہے جو ادبی نقطۂ نظر سے عمدہ ہے اور پڑھنے کے قابل۔ اخوان کے رہنما حسن الھضیبی کے بھتیجے سمیر الھضیبی میرے دوست تھے۔ ان سے اور کئی دوسرے لوگوں سے میرا رابطہ رہا۔ خاکسار نے ان سے کہا تھا کہ اخوان نے مصری، برطانوی معاہدہ ۱۹۵۴ء کی مخالفت کی ہے اور اس میں شدت آ گئی ہے، یہ بات اخوان کے لیے نقصان دہ ثابت ہوگی۔ اس معاہدہ کی رو سے ''۱۹۵۶ء میں مصر سے برطانوی فوجوں کا انخلا ضروری تھا لیکن اگر اس مدت میں تیسری عالمی جنگ چھڑ جائے تو انگریزی فوج دوبارہ مصر آ سکتی ہے۔'' یہ آخری شق اخوان کو قبول نہ تھی لیکن ناصر نے کہا تھا کہ مَیں ایک فوجی کی حیثیت سے کہتا ہوں کہ ۵۶ء تک جنگ نہیں ہوگی۔ جوں ہی ۵۶ء میں برطانیہ کا آخری سپاہی مصر سے نکلا تو ناصر نے نہر سویز پر قبضہ کر لیا۔ جب اس پر اینگلو فرنچ حملہ ہوا تو اس نے مصری برطانوی معاہدہ توڑ دیا اور وقت نے بتا دیا کہ خالص سیاسی نقطۂ نظر سے اخوان کا موقف درست نہیں تھا۔ افسوس! ناصر اور اخوان اختلاف سے مصر کی مسلم

سوسائٹی کو بہت نقصان پہنچا۔ اس سلسلہ میں عبدالناصر اور حسن الھضیبی کی تقریریں بھی سنی ہیں۔ حسن الھضیبی پر مقدمہ چلا، اس مقدمے میں اُنہوں نے ایک سوال پر کہا کہ مسلم ریاست کا صدر مفادِ عامہ کی خاطر حدود معطل کر سکتا ہے۔ نیز مغربی قوانین میں جہاں کہیں اسلام کی بنیادی تعلیم سے تصادم ہے وہاں ہم ان قوانین کو نہیں مانتے۔ ہاں جہاں انسانی وقار کے تحفظ کے لیے قوانین بنائے گئے ہیں وہاں اسلامی احکام اور سیکولر قوانین میں اختلاف نہیں ہے۔ بہرحال الھضیبی کی کتاب ''دعاۃ لاقضاۃ'' میں ایک باب مرحوم مودودی کے سیاسی نظریۂ حاکمیت کی تردید میں ہے۔ اب اخوان پر کئی دستاویزات چھپ گئی ہیں۔ ان میں سے اخوان ہی کے ایک سابق رہنما حسن الباقوری کی کتاب ''بقایا ذکریات'' کے نام سے ۱۹۹۶ء میں چھپ گئی ہے۔ شیخ حسن الباقوری وہ آدمی ہے جسے شہید حسن البناء نے وفات سے پہلے اپنا جانشین نامزد کیا تھا۔ شیخ حسن البناء کو شدت سے احساس تھا کہ اُن کی زندگی کا چراغ بجھ رہا ہے۔ کیسے؟ ۱۹۴۹ء میں نقراشی پاشا، مصر کا وزیراعظم قتل ہو گیا اور پھر قاہرہ کے مختلف مقامات پر توڑ پھوڑ کے واقعات ہوئے۔ یہ سارے واقعات اخوان میں مسلح گروپ کے انچارج عبیدالرحمٰن السندھی کے ایما پر ہوئے تھے اور مرحوم حسن البناء کے علم کے بغیر ہوئے تھے۔ حسن البناء بنیادی طور پر ایک اخلاقی مصلح تھے۔ وہ اپنے کردار اور تقریر سے دوسروں کو متاثر کرتے تھے۔ افسوس! حسن البناء کی اخلاقی اصلاح کی یہ منظم تحریک، جماعت ہی کے ایک عسکری مزاج گروپ کے ہاتھوں برباد ہو گئی۔ یہ ساری کہانی حسن الباقوری نے لکھی ہے۔ حسن الباقوری نے اپنی اس کتاب ذکریات میں ابوالکلام آزاد سے اپنی ملاقات کا ذکر بھی کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ ۱۹۵۴ء میں وہ دہلی میں مصری سفیر اسماعیل کمال کے ہمراہ مولانا آزاد سے ملے تھے۔ ''وہ (آزاد) علم و

ادب کا ایک سمندر ہے، جس کا کنارہ نہیں۔ سیاسی طور پر عالمی امور پر گہری نظر رکھتے ہیں۔'' خیر! بات ہو رہی تھی سمیر اور اُن کے ساتھیوں کی جنہیں خاکسار نے مخلص اور متدین پایا۔ ایک دفعہ انہی دوستوں (سمیر الھضیبی، احمد رائف) کے ہمراہ ڈاکٹر طٰہٰ حسین کے ایک معروف معاصر دانشور عقاد سے ملنے گئے۔ عقاد ہفتے میں ایک دن اپنے ہاں ادب وعلم کی محفل جماتے اور مداحین سے بجا طور پر داد وصول کرتے تھے۔ اس محفل میں جس میں ہم شریک تھے، احمد رائف نے ڈاکٹر اقبال کے بارے میں سوال پوچھا، تو عقاد نے کہا ''وہ (اقبال) ایک صوفی فاشسٹ تھے۔ اُنھوں نے غزالی کو نہیں سمجھا، اُن کے ہاں کوئی مربوط فلسفہ بھی نہیں ملتا۔ ہاں! بعض اشعار اور مکالمات ادب وفن کے شاہکار ہیں۔'' یاد رہے کہ ان دنوں علامہ اقبال کے چھ انگریزی لیکچروں کا عربی میں ترجمہ ہو چکا تھا، جس کے تشریحی نوٹ سیّد ابوالنصر الحسینی کے قلم سے ہیں جو ایک ہندوستانی نژاد عالم تھے اور اقبال اور آزاد دونوں سے تعلقات رکھتے تھے۔ ۱۹۷۰ء میں قاہرہ ہی میں انتقال ہوا۔ مالک رام نے مجھ سے بار بار کہا کہ تم ابوالنصر سے اقبال وآزاد کے خطوط حاصل کرو۔ خیر! اقبال نے غزالی پر جو تنقید کی ہے، اس پر نہ صرف عقاد نے بلکہ جہاں تک مجھے یاد ہے، علی گڑھ یونیورسٹی میں فلسفہ کے پروفیسر محمد عمر الدین نے بھی تنقید کی تھی۔ یہاں یہ لطیفہ بھی عرض کر دوں کہ جب اقبال کے لیکچر عربی میں شائع ہوئے تو بہت دنوں تک الاہرام میں ''الفیلسوف الھندی'' کا لاحقہ اقبال کے ساتھ چھپتا رہا۔ خاکسار نے پاکستانی سفارت خانہ کے ایک اہل کار مسٹر انصاری سے جو شعبۂ اطلاعات میں تھے، بات کی تو اُنہوں نے کہا کہ بھائی! ہم نے کئی بار ان لوگوں سے کہا ہے کہ علامہ اقبال پاکستانی ہیں، اس لیے ہندی کی بجائے پاکستانی لکھیں لیکن وہ نہیں مانتے۔ کہتے ہیں کہ اقبال قیامِ پاکستان سے پہلے متحدہ

ہندوستان میں وفات پا گئے تھے۔ شاید یہی وجہ ہے کہ قاہرہ میں بھارتی سفارت خانے نے مصری حکومت کو اپنے جن ادبی، فکری اور سیاسی رہنماؤں کے نام دیے ہیں، ان میں اقبال کا نام بھی شامل ہے۔ مزید مزے کی بات یہ ہے کہ مصری کہتے کہ فلسفہ کے ساتھ پاکستان کی بجائے لفظ ''الہندی'' زیادہ موزوں نظر آتا ہے۔ یاللعجب!